زنیرا بتول
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی فیصل آباد
ڈاکٹر پروین کلو
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

بستی ناول میں ناسٹلجیائی عناصر

Zunaira Batool
Scholar Ph.D, Department of Urdu, G.C.University, Faisalabad.
Dr. Parveen Kallu
Assosiate Prof. Department of Urdu, G.C.University, Faisalabad.

Nostalgic Elements in the Novel "Basti"

Urdu fiction is rich regarding its work and also for its well renowned its fiction writers. Urdu novel's age is almost 120 to 125 years.In this era Urdu got the world's famous fiction writers who were also recognised at international level. Intizar Hussain is one of those writers who are the legends in Urdu fiction and got the praise due to his different writing style after the creation of Pakistan. Partition and migration are the major parts of his fiction that is why he was called a nostalgic person. We found so much nostalgia on his fiction so as he was directly affected during Partition. In his most stories we found the terrible memories and incidents related to the migration which affected him mentally and emotionally so he expresses his feelings through his stories many times. He wrote many novels. Basti was his first important novel in which we found nostalgia which basically belongs to issue of the migration.

Key Words: *Novel, Nostalgia, Intizar Hussain, Basti, East Pakistan.*

ناسٹلجیا یونانی زبان کے دو الفاظ Nosto بمعنی "واپسی" اور lago بمعنی "درد" سے مل کر بنا ہے۔ جس کا مطلب ہے گھر واپس جانے کی دردناک خواہش، اسے ہم ماضی کے شدید احساس سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ فرد کے ذاتی تجربات سے بھی جڑا ہوتا ہے۔ ناسٹلجیا کا لفظ دوستی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دوستی ان حالات واقعات سے جن میں گزیدگی کے اثرات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ناسٹلجیا دراصل ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ یہ ایک نفسیاتی بیماری یا رجحان ہے۔ ناسٹلجیا کی وضاحت سب سے پہلے ایک سوئس ڈاکٹر جوہانس

ہوفر(Johannes hofer)نے ۱۶۸۸ میں اپنے میڈیکل کے حوالے سے لکھے جانے والے ایک تحریری مقالے میں کی۔ ناسٹلجیائی کیفیت کا باعث بہت سے عوامل مل کر بنتے ہیں۔ اس میں سب سے بڑا مسئلہ ہجرت کا ہے۔ ناسٹلجیا کا رجحان خاص طور پر ان سپاہیوں میں دیکھا گیا جو عالمی جنگوں میں اپنے گھروں سے دور تھے۔ پہلے پہل اسے ایک ایسی بیماری تصور کیا جاتا تھا جسے مایوسی اور اداسی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ مگر اب اسے ماضی کی خوشگوار یادوں کا استعارہ قرار دیا جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے آنے والے ادباء کے ہاں یہ رجحان ہمیں کثرت سے دیکھنے کو ملتا ہے ۔انتظار حسین کا ناول "بستی" گیارہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس کا موضوع ہجرت ہے۔ انتظار حسین کے ہاں ناسٹلجیا اور ماضی گزیدگی کا رجحان بہت زیادہ ملتا ہے ۔بلاشبہ انسان کا ماضی اور اس سے جڑی ہوئی تمام یادیں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہیں جن کے ساتھ اس کی خوشگوار اور ناخوشگوار یادیں وابستہ ہوتی ہیں انسانی لاشعور پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں اور انسان چاہتے ہوئے اور ناچاہتے ہوئے ان کے سحر سے خود کو آزاد نہیں کر پاتا۔ یہی رجحان ہمیں انتظار حسین کی نثر میں ملتا ہے۔ چونکہ ہجرت ان کا ذاتی تجربہ ہے اس لئے ہمیں ان کے ہاں ناسٹلجیائی رجحان بہت ملتا ہے ۔ناسٹلجیا کا رجحان ہر شخص کے ہاں موجود ہوتا ہے مگر ان جذبات کو لفاظی دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں۔

> "انتظار حسین کا بنیادی تجربہ ہجرت کا تجربہ ہے۔ تخلیقی اعتبار سے ہجرت کے احساس نے انتظار حسین کے یہاں ایک یاس انگیز داخلی فضا کی تشکیل ہے۔ ہجرت کا احساس اگرچہ انتظار حسین کے فن کا اہم ترین محرک ہے اور اس کی مثالیں "گلی کوچے "اور "کنکری" کے بعد کے مجموعوں میں حتی کہ تازہ ترین ناول "بستی" اور افسانہ "کشتی "تک میں مل جاتی ہے۔ اور ہجرت کا ذائقہ جگہ جگہ محسوس ہوتا ہے۔"(۱)

انتظار حسین کا ناول "بستی "ایک شاہکار ناول ہے۔ جس میں ناسٹلجیائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بظاہر ناول کا موضوع مشرقی پاکستان کا المیہ ہے مگر دراصل یہ ان بستیوں کی کہانی ہے جنھوں نے زمانے کے گرم و سرد کو برداشت کیا اور عروج و زوال کی داستانیں رقم کیں۔ ناول کا مرکزی کردار اور ہیرو ذاکر ہے۔ ناول کا آغاز ذاکر کے بچپن کے واقعات کی یادوں سے ہوتا ہے۔ ذاکر جو کہ روپ نگر کا رہائشی ہے۔ جب علاقے میں طاعون کی وبا پھیلتی ہے تو بی اماں ہجرت کے لیے کہتیں ہیں مگر اباجان انکار کر دیتے ہیں۔ ذاکر اور اس کے والدین بی اماں کی وفات کے بعد پاکستان ہجرت کر کے آچکے ہیں مگر ہجرت کا تجربہ ان کے لیے کوئی خوشگوار ثابت نہیں ہوتا۔ ذاکر کے والد جب ملک میں

افراتفری دیکھتے ہیں تو وہ اپنے گزرے دنوں کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ ملک میں احتجاج کے نام پر جو تباہی مچائی جاتی ہے وہ ماضی سے یکسر مختلف تھی۔ وہ اس زمانے کو یاد کرتے ہیں جب لوگ امن کے لیے ایک دوسرے کے سر نہیں کاٹتے تھے۔ ناول میں قیام پاکستان سے قبل اور بعد کے واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے جب ملک کئی طرح کے مسائل سے دوچار تھا۔ جہاں مہاجرین کی آبادکاری، ظلم و تشدد اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ ایسے میں ملکی سطح پر سیاسی حالات کی دگرگوں صورت حال کو دیکھ کر ذاکر کے والد ناسٹلجیائی کیفیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

"ہمارے زمانے میں بھی جلسے ہوتے تھے، شور ہوتا بھی تھا تو جلسے سے پہلے۔ مقرر اسٹیج پر آیا اور لوگ مودب ہو کر بیٹھ گئے۔ کیا تہذیب تھی اس زمانے کی۔"(۲)

انسان جب آسودہ حال ہوتا ہے تو وہ پر مسرت ہوتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کا خواب ایک ایسی ریاست کا قیام تھا۔ جہاں ان کو امتیازی حقوق حاصل ہوں، رنگ و نسل سے بالاتر مگر جس ریاست مدینہ کا خواب لے کر وہ اس سرزمین میں آئے وہ ان کے خوابوں سے یکسر مختلف تھی۔ کیونکہ روپ نگر جہاں سے انھوں نے ہجرت کی اور جس بستی یعنی پاکستان کے لیے وہ یہاں ہجرت کر کے آئے وہ دونوں ہی ان کے لیے عزیز تھے۔ روپ نگر سے بستی تک کا سفر ذاکر کا ذاتی تجربہ تھا اور یہ تجربہ تاریخ سے مل جاتا ہے۔ جو لاشعوری طور پر ناسٹلجیائی رویے کا باعث بنتی ہے اور انتظار حسین کا حافظہ اور یاداشت خود ان کو بار بار ماضی کی طرف لوٹنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار ذاکر کے علاوہ اس ناول کے دوسرے اہم کردار اس کے ماں باپ، سلامت، سریندر، افضال اور صابرہ بھی ناسٹلجیا کا شکار نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ملک کے مختلف گوشوں سے اپنے مال و جان کے تحفظ کی خاطر نئی بستی کی طرف ہجرت کی مگر وہ ان کے درمیان پھنس کر رہ گئے تھے اس حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں لکھتے ہیں۔

"جب ہم انتظار حسین کے ناول بستی ۱۹۷۹ء پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہیرو ذاکر اور اس کے گھر والے اگر ماضی کے روپ نگر کو یاد کرتے کیا تو وہ یہ سب عصری صورت حال کی تلخی کے مداوے کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ جس کا انھیں بستی (پاکستان) میں سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ "روپ نگر" اور بستی کے درمیان سینڈوچ SANDWICH ضرور بنے ہوئے ہیں لیکن انہیں "بستی" کی بقاء بھی عزیز ہے۔ وہ اس میں وہ سکون چاہتے ہیں جو انہیں "روپ نگر" میں نصیب تھا۔"(۳)

روپ نگر اب بھی جدید سہولیات سے محروم تھا۔ اگرچہ انگریز اپنے ساتھ کئی سہولیات لے کر آئے مگر قدامت پسند افراد انہیں اپنانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اور یہی حال ذاکر کے والد صاحب کا تھا۔ جنہوں نے مسجد میں بجلی لگوانے کو بدعت قرار دے دیا۔ مگر حالات کے سامنے ان کی ایک نہ چل سکی اور انہوں نے ہجرت کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ وہ پرانے خیالات کے مالک تھے۔ ذاکر اور اس کے گھر والوں کی پہلی ہجرت روپ نگر سے ویاس پور تھی ۔جب وہ یہاں پہنچے تو دونوں بستیوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ کیونکہ ویاس پور کا شمار اس وقت کے سہولت یافتہ دیہات میں سے ہوتا تھا۔ ذاکر کے لیے یہ تجربہ خوش کن تھا وہ دونوں بستیوں کا موازنہ کرتا ہے۔ ناول کا ہیرو ذاکر جو ہر لمحہ ماضی میں کھویا رہتا ہے اور اپنی بستی کی چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو بھی یاد کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ گلی کوچے وہ محلے اور ان سے جڑی تمام یادیں بہت اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ اس کا سارا بچپن وہاں گزرا تھا۔ وہ بچپن جب انسان کا دماغ ایک صاف سلیٹ کی مانند ہوتا ہے اور اس کے تمام نقوش انمٹ ہوتے ہیں۔۔ ذاکر کے لیے چھوٹی سے چھوٹی چیزیں بھی اس کے ناسٹلجیا کو ابھارتی ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں۔

> "سرکار دوعالم حضرت محمد ﷺ مدینہ میں مکہ کو یاد کرتے تھے۔ سو یہ ہی عالم انتظار حسین کے ناول بستی کے ذاکر کا ہے۔ اسے اپنے گم شدہ پیڑ نظر آرہے تھے اس کے ذہین میں گم شدہ پرندوں، گمشدہ صورتوں، نیم کے موٹے ٹہنوں میں پڑے ہوئے جھولے، صابرہ اوران جھولوں کے جھونٹوں کی تصویریں نظر آتی تھیں۔ ماضی کا روپ نگر ایک طرف اس کے خوابوں میں آتا ہے تو جاگتی آنکھوں سے لاہور اس کی روح کا حصہ بن جاتا ہے۔ (۴)

تقسیم کے بعد ذاکر کا گھرانہ ہجرت کے بعد پاکستان آگیا تھا لیکن اس کی خالہ یعنی صابرہ کی والدہ اپنی بیٹوں کے ہمراہ ہندوستان میں رہ گئیں۔ صابرہ کی بڑی بہن کی شادی مشرقی پاکستان میں ہوئی تھی۔ صابرہ صرف اس کی خالہ زاد ہی نہیں تھی بلکہ اس کی محبوبہ بھی تھی۔ اسے وہ اکثر یاد کیا کرتا تھا مگر تقسیم کے بعد رابطہ بالکل منقطع ہو چکا تھا۔ یہاں ذاکر صرف زمینی ناسٹلجیا کا ہی نہیں بلکہ شخصی ناسٹلجیا کا بھی شکار نظر آتا ہے۔ ایک طرف یادوں کے لامتناہی سلسلے اور دوسری طرف ملکی حالات، ذاکر کے گھرانے کا شمار ہندوستان کے متمول اور خوشحال گھرانوں میں ہوتا تھا مگر بہت سے پناہ گزینوں کی طرح انھیں بھی کرایے کے گھر میں مقیم ہونا پڑتا ہے۔ ایک طرف یاد ماضی اور دوسری طرف ملک میں بدامنی وانتشار کیونکہ مشرقی پاکستان کا مسئلہ سر اٹھا رہا تھا۔ شیراز ہوٹل جو کہ ذاکر اور اس کے سب

دوستوں کے جمع ہونے کا مرکز تھا وہیں سب اکٹھے ہو کر ملکی صورت حال پر تبصرہ کرتے تھے مگر ذاکر یہاں دنیاو مافیہا سے بے خبر ماضی کے گورکھ دھندے میں گم ہوتا ہے۔ جہاں روپ نگر تھا اور صابرہ تھی۔ صرف ذاکر ہی نہیں بلکہ اس سے جڑے تمام افراد بھی ہمیں ناسٹلجیائی کیفیت کا شکار نظر آتے ہیں کیونکہ اس سے جڑے تمام افراد کم و بیش اسی صورت حال کا سامنا کر کے یہاں تک آئے تھے۔ اسی لیے ذاکر کے والد اور ان کے ساتھی جب مل بیٹھتے ہیں تو موجودہ حالات کے متعلق گریہ آزادی کرتے ہیں کیونکہ احتجاج کا مطلب خون ریزی کرنا، املاک کو نقصان پہنچانا اور اپنوں کا گلا کاٹنا نہیں ہے اور نہ ہی اس سے قومی مقاصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ماضی اس طرح کے دردناک واقعات سے پر ہے۔ جب جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا تو وہ اس کے چشم دید گواہ تھے۔ جسے یاد کرتے ہوئے وہ سب ناسٹلجیائی کیفیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

> "تین دن، تین رات جلتا رہا۔ شعلے آسمان سے باتیں کریں، پھر کیا ہوا کہ بنک لٹ گیا، پھر بزازے میں لوٹ پڑ گئی، بس پھر کرفیو لگ گیا۔ کرفیو تھا۔ کہ قہر خدا تھا۔ جس نے کھڑکی سے ذرا جھانکا، ٹھائیں سے گولی چلی، آدمی ٹھنڈا" فرنگی نے بہت ظلم کیے۔ ابا جان بڑبڑائے"(۵)

ناول میں شیراز ہوٹل کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ جہاں مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد آتے ہیں۔ کچھ جوشیلے نوجوان بھی آتے ہیں جو بلند و بانگ تقاریر کرتے ہیں اور وہاں پر بیٹھے لوگوں کو تنقید کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔ ناول کا ایک اور کردار سفید بالوں والا آدمی بھی ہے۔ جو شیراز ہوٹل میں ہمیشہ اپنی مخصوص نشست پر خاموشی سے بیٹھا چائے پیتا رہتا ہے اور کبھی کبھار ملکی حالات سے متعلق رائے دریافت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی ہجرت کا کرب سہہ کر آیا تھا اور موجودہ حالات اس کے ماضی کے کرب کو تازہ کر دیتے تھے۔ ہجرت کے سبب جو مسائل درپیش آئے انھوں نے سماجی، معاشی اور سیاسی نظام کے ساتھ ساتھ انسانی زندگیوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ جہاں بچپن سے لے کر جوانی مایوسی اور ناامیدی میں گزر گئی اور انسان وقت سے پہلے بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ جاتا ہے۔ یہی کیفیت اس سفید بالوں والے آدمی کی تھی جو جوانی میں نکلا تھا مگر ہجرت کے کرب کو سہتے ہوئے اپنا خاندان اور سب کچھ لٹانے کے بعد وہ یہاں پہنچا تو بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ وہ کبھی بھی ملکی حالات پر تبصرہ نہیں کرتا تھا۔ ذاکر ہمیشہ اس کو ایک کونے میں اپنی مخصوص نشست پر بیٹھے دیکھتا تھا۔ وہ ایک دن عرفان سے مخاطب ہو کر اس کو کہتا ہے کہ پاکستان کو بچانے کا واحد حل دنگل و فساد نہیں۔ اس طرح سے قوموں کے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ باہر کے لوگوں

کو وار کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جس سے ملکی شیرازہ بکھر جاتا ہے وہ اپنے ماضی اور اس کے واقعات کو یاد کر کے ناسٹلجیائی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔

"جب میں گھر سے چلا تھا تو میرے سارے بال سیاہ تھے، اُس وقت میری عمر ہی کیا تھی۔ بیسا کیس کے پیٹے میں تھا۔ جب پاکستان پہنچا ور نہانے کے بعد آئینہ دیکھا تو میرے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہ پاکستان میں میرا پہلا دن تھا۔ گھر سے کالے بالوں اور خاندان والوں کے ساتھ نکلا تھا۔ پاکستان پہنچا تو میرا سر سفید تھا اور میں اکیلا تھا۔"(۶)

ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین نے جہاں راستے کی تکالیف برداشت کیں وہیں پاکستان آمد کے بعد بے سروسامانی کے عالم میں انھیں گھر کی یاد خوب ستاتی ہے۔ کیونکہ یہاں نہ تو مدینہ کے انصار تھے جو اپنے مہاجرین کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار تھے۔ بلکہ یہاں تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا حساب تھا۔ مگر مجبور مہاجر بے سروسامانی کے عالم میں پناہ کی تلاش میں دروازے پر دستک دیتے۔ ذاکر اور اس کے خاندان والے جو شام نگر کے علاقے میں آکر مقیم ہوئے تھے۔ جہاں ہر روز مہاجرین کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام خالی مکان بھر گئے اور جنھوں نے ان گھروں پر قبضہ جما لیا تھا ان کے دل وسیع دالانوں کے باوجود تنگ ہو گئے تھے۔ کہتے ہیں سدا وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ عروج کو زوال اور امارات کو غربت کا سامنا بھی کرنا پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ ذاکر کا گھرانہ ماضی میں خوشحال تھا مگر پاکستان آنے کے بعد انھیں منشی کا دست نگر ہونا پڑا جو کبھی سارا سارا دن ان کی حویلی میں پڑا رہتا تھا اور آج انھیں باتوں باتوں میں اپنا بندوبست کرنے کو کہہ رہا تھا۔ ذاکر کی ماں اس کے اس طرح کے رویے پر ماضی کو یاد کرتی ہیں اور ناسٹلجیائی کیفیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے پرانے گھر بار اور شان و شوکت کو یاد کرتی ہیں اسی طرح سے ذاکر کو بھی ان در و دیوار سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ جس چیز کے ساتھ انسان کا لگاؤ ہو وہ اسے کبھی بھی نہیں بھولتا۔ یہی کیفیت ذاکر کی تھی اس کو ان در و دیوار سے زیادہ لگاؤ تھا جنہیں وہ چھوڑ کر آیا تھا۔ کیونکہ گھر کیسا ہی کیوں نہ ہو جس جگہ انسان رہتا ہے اس کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی ہوتی ہے اور اس کو چھوڑنا اس کے لیے سوہان روح ہوتا ہے۔ اس کو چھوڑنے کے بعد اس کی طرف لوٹنے کی خواہش کی کسک چبھتی رہتی ہے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین ایک ایسی سرزمین کی چاہت میں اپنا گھر بار چھوڑ کر آئے تھے۔ جہاں قانون اللہ اور شریعت محمدی کا نفاذ ہو، جہاں عقائد اسلامی کا بول بالا ہو، جہاں انھیں اپنے پرانے گھر بار کی یاد نہ آئے مگر یہاں

صورت حال مختلف تھی۔ یہاں ذاکر کی ماں اور ذاکر اپنے گھر اور کمرے کو یاد کرتے ہوئے ماضی گزیدگی اور ناسٹلجیائی کیفیت کا شکار نظر آتے ہیں۔

"مجھے اپنا چھوڑا ہوا کمرہ اکثر یاد آتا تھا۔ کتنی چھوٹی چھوٹی چیزیں ایک دم دم سے کتنی وقیع بن گئی تھیں۔ کوئی غیر اہم سی بات، کوئی ننھی سی چیز کبھی بیٹھے بیٹھے کبھی چلتے چلتے یاد آجاتی۔ ایک منظر تصور میں اُبھرتا، اس سے پیوست کوئی دوسرا منظر، پھر ان دونوں سے بالکل غیر متعلق کوئی تیسرا منظر۔ یادیں لہروں کی مثال امنڈتی رہتیں اور میں ان میں بہتا رہتا۔ اور لہروں کے سلسلے کو منور کر رہی تھی۔۔۔ ۔۔۔۔۔صابرہ۔۔۔۔۔۔۔۔"(۷)

صابرہ کی یاد کے ساتھ ہی ذاکر ماضی کے ان لمحات میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ صابرہ کو چھوڑنے روپ نگر گیا تھا۔ ان کی منزل بہت قریب تھی اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مستقبل کے حسین سپنے بن رہے تھے مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ مستقبل قریب میں ان کے درمیان میلوں کی دوریاں پیدا ہو جائیں گی۔ وہ اس سفر کی یاد میں کھو جاتا ہے جو انھوں نے پہلی اور آخری مرتبہ کیا تھا۔ ذاکر اکثر بیٹھے بیٹھے محفل میں اور تنہائی میں ماضی میں گم ہو جاتا ہے اور اس کی یہ کیفیت محفل میں، دوستوں میں اور تنہائی میں اس پر طاری رہتی ہے۔ وہ جسمانی طور پر تو یہاں موجود ہوتا ہے مگر اس کی روح ماضی کی گرد چھانتی رہتی ہے۔ جہاں اس کی یادوں میں دوستوں کے ساتھ گزرا ہوا وقت، ان گلیوں کا ذکر جن میں وہ ان کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اپنے آبائی وطن کی محبت اور ان تمام چیزوں کا ذکر جن کے ساتھ اس کی وابستگی تھی اس کی ماضی کی یادوں کو تازہ کر دیتی تھیں۔ ایک دن جب وہ اپنے دوست افضال کے ساتھ باغ میں بیٹھا ہوتا ہے تو برگر کے درخت کو دیکھ کر وہ ماضی میں کھو جاتا ہے اور افضال کے پوچھنے پر وہ کہتا ہے۔

"مجھے اپنے گمشدہ پیڑ یاد آرہے تھے۔ گمشدہ پیڑ گمشدہ پرندے، گمشدہ صورتیں، نیم کے موٹے ٹہنے میں پڑا ہوا جھولا، صابرہ، لمبے جھونٹے، نیم کی نبولی پکی، ساون کب کب آوے گا۔۔۔۔۔۔۔ بوندوں سے بھیگے گال پر گری ہوئی گیلی لٹ، جیوے موری ماں کا جایا، ڈولی بھیج بلاوے گا۔۔۔۔۔۔۔ دور کے پیڑ سے آتی ہوئی کوئل کیا آواز۔ نیم کا پیڑ بھی میں نے دریافت کر ہی لیا، مگر کوئل کی آواز پہلے سنی۔ اس دیار میں وہ میرا پہلے پہل کوئل کی آواز سننا۔ از کجامی آید ایں آوازِ دوست"(۸)

ناول میں شیراز ہوٹل کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اس کے ذریعے ملکی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہاں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد آتے ہیں۔ عرفان جو کہ اخبار میں کام کرتا ہے، زاور جو سی ایس پی آفیسر ہے اور ذاکر خود ایک لیکچرار ہے۔ ذاکر کے لیے شیراز ہوٹل بھی اس کی ناسٹلجیائی کیفیت کا باعث بنتی ہے۔ وہ جب بھی یہاں آتا ہے تو اس سفید بالوں والے آدمی کو دیکھ کر خود کو ماضی کی گرفت سے آزاد نہیں کر پاتا۔ ناول میں صابرہ کا کردار بھی بہت جان دار ہے۔ جب ملک تقسیم ہوا تو ذاکر اور اس کے گھر والے پاکستان آ گئے اور صابرہ کی والدہ اس کی بڑی بہن کے پاس ڈھاکہ چلی جاتی ہیں جبکہ صابرہ یہیں انڈیا میں ہی مقیم رہتی ہے اور آل انڈیا ریڈیو میں بطور اناونسر کام کرتی ہے۔ سریندر جو کہ ذاکر کے بچپن کا دوست تھا۔ جب اس سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو ماضی کی گھٹائیں پھر سے امنڈ آتی ہیں۔ کیونکہ وہ ذاکر کو صابرہ کے حالات سے آگاہ کرتا ہے۔ سریندر اور ذاکر دونوں کا بچپن چونکہ اکٹھے گزرا تھا اس کے لیے بھی بستی کی اہمیت ویسی ہی تھی جیسی ذاکر کے لیے تھی۔ دونوں کے لیے یہ بستی ایک طرح سے ان کی ناسٹلجیائی کیفیت کا باعث تھی۔ سریندر بھی جب ویاس پور جاتا ہے تو ماضی کے تمام تر مناظر ایک فلم کی صورت میں سامنے آ کر اس کے ساتھی کا پوچھتے ہیں۔ وہ اپنی اس کیفیت کا اظہار ذاکر سے خط کے ذریعے کرتا ہے۔ ذاکر اس کے خط کو پڑھ کر اور بھی بے چین ہو جاتا ہے۔ اتنے عرصے کے بعد اچانک اگر ایک دھندلی تصویر سامنے آجائے تو انسان بے قرار ہو جاتا ہے۔ صابرہ جس سے ذاکر اب صرف خوابوں خیالوں میں ہی ملاقاتیں کرتا تھا۔ یوں اچانک جب وہ سریندر کی بابت صابرہ کے حالات سے آگاہ ہوتا ہے تو سوچتا ہے کہ کس طرح اس سے اتنے عرصے بعد رابطہ کرے۔ اگرچہ وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے مگر ایک دوسرے سے لاتعلق تھے۔ ذاکر جب اپنی والدہ سے سریندر کے متعلق بتاتا ہے تو وہ بھی ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتی ہے۔ ذاکر کی طرح اس کی والدہ بھی ماضی کو یاد کرتی رہتی ہے۔ وہ صابرہ سے بھی نالاں تھی کہ وہاں پر رہتے ہوئے بھی اس نے اپنے آبا و آجداد کی نشانیوں کی حفاظت نہیں کی۔ پاکستان آنے کے بعد انھیں جس طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑا اس کے تناظر میں وہ اکثر ماضی کو یاد کرتے کرتے ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتی تھی:

> "ویاس پور سے جب ہم چلے تو اسی وقت میں نے جدّی پستی نشانیاں کوٹھری میں سنکھوا دی تھیں اور تالا ڈال دیا تھا اور میں نے پاکستان چلنے سے پہلے بار بار تم سے کہا کہ میں روپ نگر کا ایک پھیرا لگا آؤں اور جو چیز وہاں سے لینی ہو لے لوں۔ مگر تم نے

میری ایک نہ سنی۔ ارے میں ایک مرتبہ تالا کھول کے چیزوں کو کم سے کم دھوپ تو لگا آتی۔ اتنا زمانہ ہو گیا کم بخت دیمک نہ گئی ہو۔ اس گھر میں دیمک بہت تھی۔"(۹)

قوموں کی ترقی اور تنزلی کا انحصار بہت حد تک ملکی حالات پر ہوتا ہے۔ ذاکر اور اس کے گھر والے پہلے ہی ہجرت کا کرب اور دکھ سہہ چکے تھے اور اب یہاں بھی ملکی حالات دگر گوں تھے۔ ملک میں خانہ جنگی کی وجہ سے شیراز بھی خالی پڑا ہوا تھا۔ جاڑے اور جنگ کی راتیں بہت طویل ہوتی ہیں۔ ملک میں خانہ جنگی کی وجہ سے یہ صورت حال تھی جیسے باپ کی وفات کے بعد دو بھائیوں کے درمیان ترکہ کی تقسیم پر جھگڑا ہو جائے۔ ناول میں خوف اور دہشت کا ماحول پوری آب تاب سے نظر آتا ہے۔ جہاں ہجرت کا خوف، خوابوں کے ریزہ ریزہ ہونے کا خوف، گھروں کے اجڑنے کا خوف اور جنگی کشیدگی جہاں ایک دفعہ پھر سے مستقبل کا خطرہ لاحق ہو، ذاکر کے بچپن میں جب بجلی نہیں تھی تو وہ لالٹین کا استعمال کرتے تھے۔ مگر اب جب جنگ نے انھیں دوبارہ لالٹین کے زمانے میں بھیج دیا تھا۔ اس کو لالٹین کی روشنی بہت اچھی لگتی تھی۔ جیسے وہ جگنو کی مانند ہر طرف روشن ہو۔ وہ اس کی روشنی میں پڑھتا تھا مگر ان جنگی حالات میں لالٹین کی محبت اس کے ناسٹلجیا کو ابھارتی ہے۔ ذاکر اپنے ماضی کو یاد کر کے ناسٹلجیائی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔

"اور لالٹین یوں مجھے اچھی لگتی ہے۔ لالٹینوں کے زمانے کو جب ہمارے روپ نگر میں ابھی بجلی نہیں آئی تھی اور اندر گھر میں بھی اور باہر گلی میں بھی لالٹین ہی کی روشنی ہوتی تھی، میں کس محبت سے یاد کرتا ہوں۔ بڑے ہو کر میں نے تعلیم کی ساری منزلیں بھی لالٹین ہی کی روشنی میں طے کیں، مگر اب یہ حال ہے کہ لالٹین کے زمانے کو صرف یاد کر سکتا ہوں۔"(۱۰)

"بستی" کا ہیرو ذاکر زمینی، زمانی اور شخصی ناسٹجیا کا شکار ہے۔ اسے پاکستان میں رہتے ہوئے بھی بے وطنی کا احساس کم نہیں ہوتا۔ صابرہ کی یاد کبھی روپ نگر اور ہر پیش آنے والے واقعے کے ساتھ ذاکر ماضی میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس بستی میں روپ نگر کو تلاش کرتا ہے اور اس جنگ زدہ عہد کا المیہ ہے کہ یادیں بھی دکھ کی شکل اختیار کر جاتی ہیں۔ ایک طرف ماضی کی یادیں تھی۔ تو دوسری طرف اس عہد کے حالات جہاں افراد ہی نہیں بلکہ املاک بھی انسان دشمنی اور سفاکی کی داستانیں بیان کرتی ہیں۔ یہی حالات کی ابتری سب کچھ تہس نہس کر دیتی ہے۔ ذاکر کے لیے روپ نگر اور بستی دونوں اہمیت کے حامل ہیں۔ اور یہ دونوں شہر اس کے اندر آباد ہیں۔ وہ صرف روپ کو ہی

یاد نہیں کرتا بلکہ اپنی موجودہ بستی کے لیے بھی فکر مند ہے کیونکہ اس کے موجودہ حالات اس کی ناسٹلجیائی کیفیت کو ابھارتے ہیں۔ذاکر کے کچھ دوست جو انقلاب کے داعی ہوتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جنگ کے بود نظام تبدیل ہوجائے گا وہ خود کی اصلاح کرنے کی بجائے دوسروں کو الزام دیتے ہیں۔وہ انقلاب کے دعوے دار ہیں اور تخرے ب سے تعمیر کا پہلو نکالتے ہیں۔ذاکر ایک دفعہ پھر سے وقت کی شکت وریخت کو دیکھتا ہے۔جہاں انقلاب کے بلند وبانگ دعوے کرنے والے محض تقریروں اور نعرے بازیوں تک ہی محدود رہتے ہیں۔ذاکر اس المیہ کو دیکھ کر ناسٹلجیا کا شکار ہوجاتا ہے۔

> "اس جنگ زدہ عہد کا المیہ یہ ہے کہ ہمارے دکھ،ہماری یادیں نہیں بن پاتے۔جو عمارتیں،جو مقام ان دکھوں کے امین ہوتے ہیں،انہیں کوئی ایک بم کا گولہدم کے دم نیست ونابود کر دیتاہے۔میں اس شہر کے لیے کچھ نہیں کر سکتا،دعا کر سکتاہوں سو کرتاہوں۔یہ میرے تصور میں آبادروپ نگر کے لیے بھی دعا ہے کہ اسے میں اب اس شہر سے الگ کر کے تصور میں نہیں لا سکتا۔روپ نگر اور یہ شہر مل کر میرے اندر گھل مل کر ایک بستی بن گئے ہیں"(۱۱)

ناول کا المیہ مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے والی کشیدگی کا بیانیہ ہے۔ذاکر جس کی یہ تیسری زمینی ہجرت تھی۔روپ نگر،ویاس پور اور ویاس پور سے پاکستان مگر اس کا دل روپ نگر میں تھا،جہاں صابرہ تھی۔اس کے اندر روپ نگر اور یہ شہر(پاکستان)ایک بستی کی طرح اکٹھے ہیں۔ذاکر کی طرح اس کے کئی دوست اور ان ے خاندان ہجرت کر کے آئے تھے۔افضال جو ذاکر کا دوست تھا اس کی نانی ہندوستان سے ہجرت کر کے نہیں آنا چاہتی تھی مگر اس کے گھر والے اسے باڑھ چڑھنے کا بہانہ کر کے یہاں لے آئے تھے۔مگر وہ ہمیشہ واپسی کا مطالبہ کرتی رہتی تھی۔وہ معصوم ہجرت کو باڑھ(سیلاب)چڑھنے کا عمل سمجھتی ہے اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو باڑھ اترنے کا عمل قرار دیتی ہے مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ باڑھ ایک طرف سے اتری تو دوسری طرف سے چڑھ گئی ہے۔افضال کی نانی خود کو اس ناسٹلجیا سے باہر نہیں نکال پائی تھی۔ذاکر جب افضال کی نانی کے متعلق جانتا ہے تو بہت حیران ہوتا ہے کہ صرف وہی نہیں جو ناسٹلجیا کا شکار ہے بلکہ ہندوستان کا ہر باسی جو اپنی زمین چھوڑ کر آیا ہے وہ بے یقینی کی حالت میں ہے۔ہندوستان کی تقسیم جو مسلمانوں کے لیے خوشی کا پیغام تھی وہیں پر یہ بہت بڑا المیہ تھا۔کیونکہ اس نے صرف دو ملک ہی تقسیم نہیں کیے تھے بلکہ خاندانوں کو بھی تقسیم کر دیا تھا۔دونوں ملکوں کے باسی ایک دوسرے کی یاد میں تڑپ

رہے تھے۔ذاکر کی محبوبہ صابرہ جو ابھی تک ہندوستان میں تنہا رہ رہی تھی اور ذاکر اپنے دوست سریندر کے ذریعے اس کے حالات سے باخبر تھا۔ سریندر اس کو بتاتا ہے کہ وہ اس کے ذکر پر رو پڑی تو وہ بے چین ہو جاتا ہے۔شاید وہ ابھی تک اس محبت کو نبھا رہی تھی جیسے وہ یہاں آنے کے بعد بھول چکا تھا۔

"رو پڑی؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ماں بہن کی یاد آنے پر رو پڑنا عجیب بات تو نہیں ہے اور بالخصوص ایسی حالت میں کہ ان کا اتا پتہ ہی نہیں ہے زندہ ہیں یا مر گئیں۔یہ توجیہہ اسے بہت معقول نظر آئی۔ مگر فوراہی اسے بے چینی سی ہونے لگی جیسے یہ توجیہہ ناکافی ہو۔میرے خطوں کا سن کے رو پڑی، کیوں؟ میں ظالم؟ وہ کیسے؟"(۱۳)

ذاکر کی ماں اکثر اپنے پرانے گھر اور اس کی زندگی کو یاد کرتی ہے، جیسے وہ چھوڑ کر آئی تھی اور خاص طور پر ان چیزوں کو جن کو وہ بطور امانت سنبھال کر آئی تھی۔وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ ایک دفعہ اس کوٹھری میں پڑی ہوئی چیزوں کو جا کر دھوپ لگوا دے مگر ایسا ناممکن تھا۔جہاں علیحدگی کے وقت مل جل کر رہنے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے اور اب دوبارہ ملک توڑنے کی چالیں چل رہے تھے وہاں واپسی ناممکن تھی۔اکثر و بیشتر پیش آنے والے واقعات کی وجہ سے ذاکر کی والدہ کی سوئی ہوئی یادیں جاگ اٹھتی ہیں۔جب شریفین بوا ان کے گھر آتی ہے تو ذاکر کی ماں اس سے وہاں کے حالات کے متعلق تفصیل سے پوچھتی ہے۔شریفین بوا بھی پاکستان کے حالات سے نالاں نظر آتی ہیں۔وہ یہاں پر موجود لوگوں کی مادیت پرستی کو دیکھ کر ماضی کی اقدار و روایات کا ذکر کرتی ہیں۔دوسری طرف ذاکر کی ماں اس کوٹھری کی چابی کے لیے فکر مند تھیں جو وہ کہیں رکھ کر بھول گئیں تھیں۔ آج اتنے برس گزرنے کے بعد بھی وہ اپنی جدی پشتی چیزوں کو یاد کرتی ہیں۔چاندی کی رکابیاں، کربلائے معلی سے منگوایا ہوا کفن، بڑے ابا کی مدینہ منورہ والی جانماز اور خاک شفا کی سجدہ گاہ اور بڑی اماں کی پٹاری اور رحل وغیرہ۔پچیس برس گزرنے کے بعد اب جب پاکستان کے حالات اس قدر مختلف تھے تو وہاں کیا اب تک وہ چیزیں محفوظ تھیں۔ سلیم اختر لکھتے ہیں۔

"بستی بے جڑ لوگوں سے آباد ہے۔اس لیے وہ سب بے یقینی، لاتعلقی، تشکیک اور ناسٹلجیا کے مریض ہیں۔بزرگوں کی نسل کا ماضی، ان کے شجرہ نسب، بوسیدہ مخطوطوں، دیمک لگے پیلے ورقوں والی کتابوں، پرانے رقعوں، پرچوں، نسخوں، دعاؤں، تعویذوں اور چابیوں کی صورت میں ہے۔نئے ملک اور بدلے ہوئے حالات

مین یہ بے کار اشیاء تو ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن بے معنی نہیں کہ یہ ماضی کے استعارے ہیں۔"(۱۴)

آخر کار وہ چابیوں کا گچھا مل ہی گیا جس کے بارے میں ذاکر کی والدہ بے حد پریشان تھیں اور ذاکر کے والد نے مرنے سے پہلے فخریہ طور پر اسے دیتے ہوئے کہا تھا کہ انھوں نے اسے کتنی حفاظت سے رکھا تھا اور زنگ تک نہ لگنے دیا۔ ذاکر ان چابیوں کو دیکھ کر ماضی پرستی کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ یادوں کا پنڈورا باکس بہت گہرا تھا۔ اس وطن میں بھی وہ اپنے آباواجداد کی نشانیوں کی حفاظت چاہتے تھے۔ خاص طور پر تب جب وہ ملک میں جابجا مفاد پرستوں کو دیکھتے ہیں تو انھیں اپنا پرانا گھر اور چابیاں یاد آنے لگتی ہیں۔ جب تک وہ چابیاں مل نہیں جاتی وہ ان کی بازیافت پر اصرار کرتی رہتی ہیں۔ اور ان کے ملنے پر اس قدر خوش ہوتی ہیں۔ مگر ذاکر کے لیے ان کی اہمیت ویسی نہ تھی جیسی اس کے والدین کے لیے تھی۔ کیونکہ اس کا ان پر کوئی حق نہ تھا اور نہ ہی اس کے والدین کا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لوٹنے کی خواہش کے ساتھ ساتھ پچھتاوا بھی ہے مگر اب تاوان ادا نہیں ہو سکتا۔ ذاکر لے لیے یہ تمام چیزیں اور ان کا ذکر اس پر ناسٹلجیائی کیفیت طاری کر دیتے تھے۔

"باپ دادا کی امانت۔ وہ بڑبڑایا۔ "بیٹے یہ اس گھر کی چابیاں ہیں جس پر اب تمھارا کوئی حق نہیں ہے۔ اس گھر اور اس زمین کی روپ نگر کی چابیاں۔ چابیاں میرے پاس ہیں اور وہاں ایک پورا زمانہ بند ہے۔ گزرا ہوا زمانہ۔ مگر زمانہ کہاں گزرتا ہے۔ گزر جاتا ہے پر نہیں گزرتا۔ آس پاس منڈلاتا رہتا ہے"(۱۵)

یادوں کا یہ لامتناہی سلسلہ تھا۔ ذاکر جس کی یادیں ہر لمحہ اس کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ جہاں صابرہ تھی اس کے نرم و گداز پاؤں اور وہ قبر جو اس نے بچپن میں کھیل کے دوران بنائی تھی۔ ناول نگار نے ہر ایک چیز کو ایک معنویت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جہاں ہجرت کا کرب اور یادوں کا سنگم ہے۔ ذاکر اور صابرہ نے بچپن میں کھیل کے دوران جو قبر بنائی تھی اب اس میں خود زندہ دفن ہو چکے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد ذاکر اپنے عہد و پیمان کو بھول گیا تھا مگر سریندر سے خط و کتابت کے بعد وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اور صابرہ دونوں ہی زندہ اور بے جان لاشیں بن چکے ہیں۔ مرنے والے دینا والوں کے حالات سے اور دنیا والے مرنے والوں کے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں مگر یہاں ذاکر اور صابرہ ایک دوسرے کے لیے زندہ در گور ہو چکے تھے۔ یہاں مصنف نے بچپن کے کھیل اور اس قبر میں مماثلت بیان کی ہے۔ جب بچے مٹی کے اندر پاؤں دبا کر ایک گھر بناتے ہیں اور دیکھتے ہیں کی کس کا گھر مضبوط ہی

کے ساتھ زیادہ دیر تے قائم رہتا ہے۔ ایسے ہی گھر کی تعمیر کی خواہش ان دونوں نے مل کر کی تھے۔ جب ذاکر نے اس کع ایک مرتبہ دہلی میں ساتھ چلنے کا کہا تھا۔ اس نے تو وعدہ نبھادیا اور وہاں بس گئی مگر ان کے خواب اس مٹی کے گھروندے کی طرح ریزہ ریزہ ہوگئے۔ ذاکر اپنے اور صابرہ کے بچپن کے لمحات کو یاد کر کے ناسٹلجیائی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔

"ذاکر ہمارے لیے بھی قبر بنادے"

"میں کیوں بناؤں، خود بنالے۔"

صابرہ خود گیلی مٹی کھرچ کر اپنے گورے پیر پہ جماتی ہے اور کب اس کے اندر سے نکالتی ہے تو وہ اپنی کھکھل کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ "ذاکر! میری قبر تیری قبر سے اچھی ہے۔" "اجی ہاں؟" "اپنا پاؤں اس میں ڈال کے دیکھ لے" صابرہ کے نرم پیر کے سانچے پر بنی ہوئی قبر، اس میں میرا پاؤں، کتنی نرم، کتنی خنک۔۔۔"(۱۶)

ناول میں انتظار حسین نے جس طرح ہر چیز کا بیانیہ پیش کیا ہے وہ اپنے اندر ہر ایک چیز کی معنویت کے ساتھ موجود ہے۔ چوں کہ یہاں ذاکر کی ناسٹلجیائی کیفیت کا ان تمام چیزوں کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اگر حال کا کوئی لمحہ ماضی کے ساتھ مربوط ہو جائے تو ماضی کے مناظر انسان کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ ذاکر کی نظر سے مصنف نے اپنے ذاتی تجربے کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ وہ اکثر اپنے آبائی وطن کو یاد کرتے ہیں۔ اسی طرح کا رویہ ہمیں قرۃ العین کے ہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے ہاں مشترکہ تہذیب کا ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ انتظار حسین کے ناولوں کا حاوی رجحان بھی مشترکہ تہذیب ہے۔ ڈاکٹر راشدہ قاضی لکھتی ہیں۔

"انتظار حسین کے ہاں ہجرت ایک بہت بڑے استعارے کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ اس لیے اسے ماضی کا ناسٹلجیا کہنا چاہیے۔ ماضی کی تہذیب سے انتظار حسین کا جنونی لگاؤ کبھی ہجرت کا حوال بن کر سامنے آتا ہے اور کبھی سقوط ڈھاکہ ان کا تخلیقی تجربہ بنتا ہے۔ ماضی کی محدود دینا میں کھوئے رہنا انتظار کا دل پسند مشغلہ بن گیا ہے۔ وہ بہت کم ماضی سے آنکھیں کھول کر دیکھتے ہیں۔"(۱۷)

۱۹۷۱ء کی جنگ نے جہاں پاکستان کو اس کے دائیں بازو مشرقی پاکستان سے محروم کر دیا۔ وہیں اہل اقتدار کی ریشہ دانیوں کی وجہ سے عوام کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر نقصان پہنچایا۔ ذاکر جب شیراز کی حالت کو دیکھتا ہے جو

خانہ جنگی کے بعد ہوتی ہے تو ایک دم پھر سے ناسٹلجیائی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ناول "بستی"جو بیک وقت زمینی،زمانی اور شخصی ناسٹلجیا سے بھرپور ہے۔جہاں صابرہ تنہا دہلی میں ہے اور اس کی ماں اور بہن ڈھاکہ میں اور سقوط ڈھاکہ کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے لیے مفقود الخبر ہیں۔ذاکر کی ماں بھی صابرہ سے نالاں ہیں کہ اس نے اپنے خاندان کی نشانیوں کی حفاظت نہیں کی۔ذاکر نے بھی صابرہ سے بے وفائی کی اور یہاں آنے کے بعد اسے بھول گیا مگر صابرہ نے نہ تو زمین کو چھوڑا اور نہ ہی ذاکر کی یاد کو دل سے نکالا اور چپ چاپ اسی زمین میں بس گئی۔شاید امید یا انتظار کی کیفیت میں۔

حوالہ جات

۱- گوپی چند نارنگ،انتظار حسین کا فن متحرک زہین کا سیال سفر،مشمولہ:عالمی اردو ادب انتظار حسین نمبر،(مدیر:نند کشور وکرم)کرشن نگر دہلی:عالمی اردو ادب،دسمبر ۲۰۱۶ء،ص:۲۷۱

۲- انتظار حسین،بستی،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء،ص:۲۲

۳- ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،آزادی کے بعد اردو ناول۔کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۹۷ء،ص:۱۷۹

۴- ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار،لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۱۷ء،ص:۱۴۷

۵- انتظار حسین،بستی،ص:۶۴

۶- انتظار حسین،بستی،ص:۷۳

۷- انتظار حسین،بستی،ص:۸۱

۸- انتظار حسین،بستی،ص:۸۴-۸۳

۹- انتظار حسین،بستی،ص:۱۲۷-۱۲۶

۱۰- انتظار حسین،بستی،ص:۱۳۸

۱۱- انتظار حسین،بستی،ص:۱۴۱

۱۲- انتظار حسین،بستی،ص:۱۹۲

۱۳- سلیم اختر،ڈاکٹر،بے جڑ لوگوں کی بستی،مشمولہ:عالمی اردو ادب انتظار حسین نمبر،(مدیر:نند کشور وکرم)کرشن نگر دہلی:عالمی اردو ادب،دسمبر ۲۰۱۶ء،ص:۳۷۳

۱۴- انتظار حسین،بستی،ص:۱۹۷

۱۵- انتظار حسین،بستی،ص:۱۹۸

۱۶- راشدہ قاضی،غلام یسین،رانا۔ڈاکٹر،بستی۔۔۔۔ایک مطالعہ،مشمولہ زبان وادب،(مدیر اعلی:ڈاکٹر آصف اعوان)فیصل آباد:گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،جنوری تاجون ۲۰۱۶ء،ص:۱۴۸

References in Roman Script

1. Gopi Chand Narang, Intezar Hussain ka Fan Mutahrik, Zaheen ka Siyal Safar, Mashmoola Almi Urdu Adab Intezar Hussain Number (Mudir: Nand Kishwar Karam), Krishan Nagar, Delhi, Almi, Urdu Adab, Dec 2016, P 271
2. Intizar Hussain, Basti, Lahore, Sang Meel Publications, 2013, P 22
3. Mumtaz Ahmed Khan, Dr, Azadi k Bad Urdu Novel, Karachi, Anjuman Taraqi Urdu Pakistan, 1997, P 179
4. Mumtaz Ahmed Khan, Dr, Urdu Novel k Hama Geer Sarokar, Lahore, Fiction House, 2017, P 147
5. Intizar Hussain, Basti, P 64
6. Intizar Hussain , Basti, P 73
7. Intizar Hussain, Basti, P:81
8. Intizar Hussain, Basti, P: 83-84
9. Intizar Hussain, Basti, P: 126-127
10. Intizar Hussain, Basti, P: 138

Intizar Hussain, Basti, P: 141

12. Intizar Hussain, Basti, P: 192
13. Saleem Akhtar, Dr, By Jar Logo ki basti, Mashmoola Almi Urdu Adab Intizar Hussain Num, (Mudir: Nand Kishwar Karam), Krishan Nagar Delhi, Almi Urdu Adab, Dec 2016, P 373

14. Intizar Hussain, Basti, P 197
15. Intizar Hussain , Basti, P 198
16. Rashida Qazi, Ghulam Yasin Rana, Dr, BAsti…. Ek Mutalia, Mashmoola Zuban o Adab (Mudir Ala Dr. Asif Awan), Faisalabad, Govt. College University, January 2016, P 14